درس ۳

اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے

مطلوبہ اوصاف

(درس ۲ کا تتمہ)

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾﴾ (الشوریٰ) ...... صدق اللّٰہ العظیم

قبل ازیں ہم دو نشستوں میں ’’اقامتِ دین کی فرضیت اور اس کے لیے زوردار دعوت‘‘ کے عنوان سے سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ اور اسی کے تتمہ کے طور پر آیات ۴۷‘ ۴۸ کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے سورۃ الفتح کی آخری آیت اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ کی روشنی میں ’’اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف‘‘ کا مطالعہ کیا۔ اسی مناسبت سے اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف سورۃ الشوریٰ میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ جن لوگوں کو اقامتِ دین کی فرضیت کا شعور حاصل ہو جائے اور وہ اس کے لیے کمرِ ہمت کس لیں‘ اس کے لیے ارادہ کر لیں‘ انہیں یہ جان لینا چاہیے کہ اس جدوجہد کے لیے کچھ مطلوبہ اوصاف ہیں۔ تو گویا کہ وہی مضمون جو اِس سے پہلے سورۃ الفتح کی آخری آیت اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ میں آ چکا ہے‘ اب یہاں سورۃ الشوریٰ کی آیات ۳۶ تا ۴۳ میں آ رہا ہے۔ یہ مضمون خاصا طویل ہے‘ لیکن اس نشست میں اس پر اِختصار سے گفتگو کی جائے گی۔ ان آیات کا تفصیلی درس مَیں کراچی میں شامِ الھدیٰ کی دو نشستوں میں دے چکا ہوں اور اس کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ موجود ہیں۔ جو حضرات تفصیل اور وضاحت کی ضرورت محسوس کریں وہ ان کیسٹس سے استفادہ کریں۔

اب ہم ان آیات کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾

’’جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی (چند روزہ) زندگی کا سروسامان ہے‘ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں۔‘‘

ترجیح آخرت

پہلی آیت میں دو اوصاف بیان ہوئے ہیں اور یہ ایمان کالبِ لباب اور حاصل ہے۔ ہمارے ہاں یہ تشبیہہ اور تمثیل کئی مرتبہ بیان ہو چکی ہے کہ دین کا جو عملی پہلو ہے اس کے لیے ایمان کو جڑ کا درجہ حاصل ہے۔ یہ عملی پہلو چاہے انسان کی انفرادی زندگی اور اس کی ذات سے متعلق ہو' چاہے شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کی جدوجہد ہو' ان سب کے لیے ظاہر بات ہے کہ اصل شے وہ جڑ ہے جس سے کہ غذا ملتی ہے' جس سے توانائی حاصل ہوتی ہے' اور وہ ایمان ہے۔ لہٰذا یہاں ان اوصاف کے ضمن میں سب سے پہلے ایمان کا لب لباب بیان کر دیا گیا۔ اس ضمن میں پہلی شے یہ فرمائی گئی کہ ﴿فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج﴾ ''جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا کی زندگی کا سرو سامان ہے''۔ جو کچھ بھی تم دیے گئے ہو' کوئی بڑی سے بڑی شے یا چھوٹی سے چھوٹی شے' وہ اس دنیا کی چندروزہ زندگی کا برتنے کا سامان ہے۔ ''شَيْءٍ'' یہاں نکرہ ہے اور نکرہ عربی زبان میں تفخیم کے لیے بھی آتا ہے' تعظیم کے لیے بھی اور تحقیر کے لیے بھی۔ یعنی کسی چیز کی عظمت کا بیان کرنا ہو' اس کی بڑائی کا بیان مقصود ہو یا اس کا چھوٹا پن ظاہر کرنا ہو تو اسے نکرہ استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو جمع کیا ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی شے جو دنیا میں مل جائے' فرعون کی حکومت' نمرود کی حکومت یا قارون کا خزانہ' اور کوئی چھوٹی سے چھوٹی شے جو یہاں کسی کو ملتی ہے' اس کے بارے میں یہ واضح فرما دیا کہ اوّل تو وہ ''اُوْتِيْتُمْ'' کے حکم میں ہے' وہ تمہاری اپنی کمائی ہوئی نہیں ہوتی' دی گئی ہوتی ہے۔ سورۃ الحدید میں الفاظ آئے ہیں کہ ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ ''اور خرچ کرو ہر اُس چیز میں سے جس کا اس نے تمہیں اختیار بخشا ہے''۔ یہاں بھی صرف اسلوب کے بدلنے سے ایک اہم رہنمائی ہو گئی کہ یہ نہ سمجھنا کہ یہ تمہارا اپنا کسب ہے' تمہاری اپنی کمائی ہے' تمہاری اپنی محنت سے حاصل کردہ شے ہے' تمہاری اپنی صلاحیتوں کا ثمرہ ہے' تمہاری ذہانت کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ سمجھو گے تو تمہارا قدم قارونیت کی طرف اٹھ جائے گا' اس لیے کہ اُس نے یہ کہا تھا کہ یہ دولت و ثروت میرے علم کا حاصل ہے ﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾

دوسری بات یہ واضح کر دی گئی کہ یہ ''مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' ہے' یہ بس اس چندروزہ دنیا کی زندگی کا برتنے کا سامان ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ نے تمہیں یہاں امتحان کی خاطر کچھ عرصے کے لیے ٹھہرائے رکھنا ہے' جو تیس چالیس سال بھی ہو سکتا ہے' پچاس ساٹھ سال بھی اور دس بیس سال بھی۔ یہ تمہارا امتحانی عرصہ ہے۔ تو اگر کمرۂ امتحان میں تمہیں ایک کرسی اور میز دے دی گئی' کوئی قلم دے دیا گیا اور وہاں تمہارے لیے پانی کا کوئی اہتمام کر دیا گیا کہ کوئی ملازم کھڑا ہے' تو کیا ان چیزوں کے بارے میں تمہارا یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ تمہاری ملکیت ہیں؟ ان سے تمہیں کوئی قلبی لگاؤ ہوتا ہے؟ بلکہ ساری توجہ کا ارتکاز تو امتحان پر ہوتا ہے۔ تو بس یوں سمجھو کہ یہ امتحانی وقفہ گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہیں کچھ سامان دے دیا ہے۔ اگر اس سے زیادہ اس کے لیے دل میں کوئی وقعت پیدا ہو گئی اور اس سے زیادہ کوئی تعلق خاطر قائم ہو گیا تو پھر اور جو چاہو کرو' اُس (اقامت دین کی) وادی میں قدم نہ رکھنا ع جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں! نقطۂ نظر کا اگر یہ فرق واقع نہیں ہوا ہے تو اس راستے پر نہیں چل پاؤ گے۔ سوچ سمجھ کر اس وادی میں قدم رکھو ؎

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

دلوں کو ٹٹولو کہ اس راہ کے مسافر کا وصفِ لازم یہ ہے کہ بڑی سے بڑی شے اور چھوٹی سے چھوٹی شے جو کچھ ملی ہے' یہ صرف اس دنیا کی عارضی زندگی کے برتنے کا ایک سامان ہے۔ اس سے زیادہ اس کی وقعت' اس سے زیادہ اُس کی قدر و قیمت' اس سے زیادہ اس سے کوئی تعلقِ خاطر اور اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ کوئی قلبی لگاؤ اگر ہے تو گویا کہ آدمی پہلے ہی امتحان میں ناکام ہے ؎

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے' نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے!

پھر تو انسان اس شعر کا مصداق بنا رہے گا کہ چلنا چاہتا ہے' چل نہیں پاتا۔ دل میں آگے بڑھنے کی آرزو ہے' خواہش ہے' لیکن پاؤں میں کوئی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس راستے پر چلنا ہے تو اس مخمصے سے آزاد ہو کر آؤ۔

آگے فرمایا: ﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی' اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اپنے ربّ پر توکل کرتے ہیں''۔ ایک لفظ میں اس وصف کو ''ترجیح آخرت'' کا عنوان دیا جا سکتا ہے کہ مطلوب آخرت رہے' دنیا نہ رہے۔ قدر و قیمت آخرت کی نعمتوں کی ہو' دنیا کے ساز و سامان کی نہ ہو۔ یہ ہے اس راستے کی شرطِ اوّل۔

توکل علی اللہ

ایمان کا دوسرا نتیجہ وثمرہ اور لب لباب ''توکل علی اللہ'' قرار دیا گیا کہ ﴿وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ ''اور وہ اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں''۔ چنانچہ توکل صرف اللہ پر ہو' توکل ساز وسامان اور اسباب ووسائل وذرائع پر نہ ہو' توکل اپنے زورِ بازو پر نہ ہو' توکل اپنی ذہانت وفطانت پر نہ ہو۔ یعنی پہلی شرط تو یہ کہ دنیا کی عظمت سے دل کو خالی کر کے آؤ۔ اور دوسرے یہ کہ اس راہ میں جو کچھ تمہیں کرنا ہے اس کے لیے بھی بھروسہ اگر اپنے زورِ بازو پر اور اپنی ذہانت وفطانت پر ہے تو پھر بھی ناکام ہو جاؤ گے۔ توکل کلیتاً اللہ کی تائید ونصرت پر' اللہ کی توفیق پر اور اللہ کی مدد پر ہو۔ ہمارا کام محنت کرنا' مشقت جھیلنا' ایثار کرنا' قربانیاں دینا ہے۔ اگر ہم یہ کر گزریں تو ہم تو سرخرو ہو جائیں گے۔ ہوگا وہی جو وہ چاہے گا' اور اُس وقت ہوگا جب اس کو منظور ہوگا۔ یہ فیصلہ ہماری خواہش کے مطابق نہیں ہوگا۔ ہم تو چاہیں گے کہ فوراً لپک کر منزل پر جا پہنچیں ع منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے! ہر شخص یہی چاہے گا۔ کون چاہے گا کہ میں چلتا چلا جاؤں' چلتا چلا جاؤں اور منزل پھر بھی نگاہ کے سامنے نہ آئے۔ لیکن اس کے لیے بھی تیار رہو کہ اگر اللہ کو ابھی یہ مطلوب نہیں ہے تو پھر ہمیں بھی وہی چیز پسند ہے جو اسے پسند ہے۔ یہ راضی برضائے ربّ کا مقام ہے۔

یوں سمجھ لیجیے کہ اس ایک آیت کے اندر سورۃ التغابن کے مضامین کا خلاصہ موجود ہے۔ دل اس پر جما ہوا ہو کہ ہار اور جیت کے فیصلے کا دن تو وہ ہے ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ جو اُس دن ہارا' وہ ہارا اور جو جیتا' وہ جیتا۔ یہاں کسی کو کیا ملا؟ فرض کیجیے کہ کل صبح کسی کو پھانسی ہونی ہے اور آج آپ اسے مخملیں گدّے پر سلا دیں تو اس کے لیے وہ مخملیں گدّا چہ معنی دارد؟ اسے پتا ہے کہ صبح اسے پھانسی ہونی ہے۔ اس اعتبار سے یہاں کے ساز وسامان اور یہاں کے مال ومتاع کی کوئی وقعت دل میں نہ رہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ انہیں استعمال نہ کرو۔ یہ بالکل دوسری بات ہے۔ اللہ نے دنیا میں جو کچھ دیا ہے استعمال کے لیے ہی دیا ہے' لہٰذا اللہ کی دی ہوئی چیزوں کو دل کھول کر برتو۔ اگر اللہ دولت دیتا ہے تو اسے استعمال کرو' لیکن دولت کو اپنے دل میں مت داخل ہونے دو۔ اس دولت کو بھی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ بناؤ' اسے اِنفاق فی سبیل اللہ اور ادائے حقوق میں صرف کر دو۔ فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط﴾ (الاعراف:۳۲) ''(اے نبیؐ! ان سے) کہیے کہ کس نے حرام کر دیا ہے اللہ کی اُس زینت کو جسے اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے اس کی بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں ممنوع کر دیں؟'' چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلزَّهَادَةُ فِی الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِی الدُّنْيَا اَنْ لَا تَكُوْنَ بِمَا فِیْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِیْ يَدَیِ اللّٰهِ))(۱)

''دنیا میں زہد (اپنے اوپر) حلال کو حرام کر لینے اور مال ودولت کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے' بلکہ دنیا میں زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے اس پر تمہارا توکل اور اعتماد زیادہ نہ ہو جائے اُس چیز سے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب الزهد عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی الزهادة فی الدنيا۔

یعنی اپنی ذہانت' اپنی فطانت' اپنے وسائل اور اپنے ذرائع پر اعتماد نہ رہے' بلکہ اعتماد اور توکل اللہ پر ہو۔ اور سورۃ التغابن کی وہ آیت بھی ذہن میں رکھیے: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ''اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں' اور اللہ پر ہی اہل ایمان کو توکل کرنا چاہیے''۔ اہل ایمان کا توکل ذاتِ باری تعالیٰ پر مرتکز ہو جانا چاہیے۔

تو اس ایک آیت میں دو اوصاف آ گئے: (۱) ترجیح آخرت (۲) توکل علی اللہ۔ اصل میں یہ ایمان کے دو نتائج یا دو ثمرات ہیں' اور یہ اس راستے کی اوّلین شرائط (pre-requisites) ہیں۔ انسان کی شخصیت میں اور اس کی سوچ اور نقطۂ نظر میں ایمان کے نتیجے میں جو تبدیلی اور انقلاب پیدا ہونا چاہیے یہاں ان کا حوالہ دے دیا گیا ہے کہ انسان کو اس وادی میں قدم رکھنے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ اس کے دامن میں ان دونوں چیزوں کی پونجی موجود ہے یا نہیں۔

اگلی آیت میں پھر دو اوصاف بیان ہوئے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾

''اور وہ لوگ کہ جو پرہیز کرتے ہیں بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں''۔

کبائر اور فواحش سے اجتناب

''جنب'' پہلو کو کہتے ہیں اور اجتناب کا مفہوم ہے پہلو بچائے رکھنا' پہلو تہی کرنا' کسی چیز سے بچ کر چلنا۔ ''اجتناب'' ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ لوگ جو اجتناب کرتے ہیں' جو بچتے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو بچائے رکھتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے۔ یہ جو لفظ ''کبائر'' یہاں آیا ہے یہ مضمون قرآن مجید میں دو اور مقامات پر' سورۃ النجم اور سورۃ النساء میں بھی آیا ہے۔ اس سے اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس وصف (کبائر سے اجتناب) کی اہمیت یہ ہے کہ انسان پر جیسے کچھ بہت سے دوسرے جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے ایسے ہی نیکی کا بھی جب آدمی پر ایک غلبہ ہوتا ہے تو اس کی باریک بینیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں' اس کی حس زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک برائی سے آپ نے اپنے آپ کو بچایا تو اب اس سے چھوٹی برائی نظر آئے گی۔ اس کو میں نے کئی مرتبہ بیان کیا ہے کہ یہ بالکل ایسے ہے جیسے پیاز کا ایک چھلکا اتاریئے تو پھر آگے دوسرا چھلکا ہے۔ اس دوسرے چھلکے پر جو داغ ہے وہ آپ کو نظر نہیں آئے گا جب تک آپ پہلا چھلکا نہیں اتاریں گے۔ اس سے پہلے آپ کو اس کا احساس ہی نہیں ہوگا کہ میرے اندر یہ خرابی بھی ہے۔ جب پہلا چھلکا اترے گا' پہلی خرابی سے آپ اپنے آپ کو بچا لیں گے' اپنا دامن پاک کر لیں گے تو دوسرا چھلکا نظر آئے گا۔ دوسرا چھلکا اتاریں گے تو آگے ایک تیسرا چھلکا ہے۔ پھر اس کا کوئی داغ ہے جو نظر آئے گا۔ جب تک دوسرا چھلکا نہیں ہٹے گا' وہ نظر نہیں آئے گا۔ تو یہ ایک فطری تدریج ہے' لیکن اس میں بھی انسان سے ایک غلو ہو جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اصلاحِ ذات میں اگر غلو ہو جائے گا تو وہ اقامتِ دین کی راہ کی رکاوٹ بن جائے گا۔ اگر آپ کی ساری توجہ اپنی انفرادی اصلاح پر مرتکز ہو کر رہ جائے اور آپ اپنے نفس ہی کو مانجھنے اور رگڑنے میں لگے رہیں تو پھر معاشرے کی اصلاح اور اللہ کے دین کے غلبہ کی طرف آپ کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔ ہمارے ہاں رہبانیت کی طرز پر خانقاہیت کا جو ایک انسٹی ٹیوشن بن گیا ہے اس میں ساری توجہ انفرادی اصلاح پر ہے کہ اب اسی میں لگے رہو۔ بعض صوفیاء کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ چالیس سال تک یہ ریاضت کرتے رہے۔ خدا کے بندو! چالیس برس کی ریاضت کے بعد کون سا وقت آدمی کے پاس رہ گیا کہ وہ اس ماحول کی اصلاح کے لیے بھی نکلے' اور اس کے لیے بھی اپنی توانائیاں کھپائے' اس ماحول کے اندر کوئی تبدیلی لانے کے لیے باطل کو للکارے اور نیکی کی قوتوں کو منظّم کر کے باطل کے ساتھ ٹکرا دے؟

انفرادی اصلاح اور معاشرے کی اصلاح' یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ چلنے چاہئیں اور ان میں عدم توازن نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی نہ ہو کہ آدمی اپنے آپ کو بھولا رہے اور دوسروں کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے۔ یہ ایک انتہا ہے' جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (البقرۃ) ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو' درآں حالیکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟'' اور دوسری انتہا یہ ہے کہ اپنی انفرادی اصلاح میں غلو سے کام لیا جائے اور اجتماعی اصلاح سے اغماض برتا جائے۔ اب آپ غور کیجیے' اسی شہر لاہور میں ایک صاحب موجود ہیں' انتہائی نیک آدمی ہیں' وہ گوشت اس لیے نہیں کھاتے کہ کچھ پتا نہیں کہ صحیح ذبح ہوا یا نہیں ہوا۔ پھل اس لیے نہیں کھاتے کہ آج کل باغات کا جو ٹھیکہ ہوتا ہے وہ صحیح طریقے پر نہیں ہوتا۔ اس طرح انہوں نے نامعلوم کیا کیا چیزیں اپنی خوراک میں سے خارج کی ہوئی ہیں۔ تو انفرادی زہد کا تو یہ عالم ہے' لیکن اس ماحول میں رہ رہے ہیں جس میں باطل کا غلبہ ہے اور اس کے ازالے کے لیے کسی اجتماعی جدوجہد کی ان کے اندر کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ عدم توازن کہ ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ فلاں صاحب اتنے زاہد' اتنے عابد اور اتنے متقی ہیں کہ ان کا گھوڑا بھی مشکوک گھاس نہیں کھاتا۔ ٹھیک ہے! اللہ تعالیٰ وہ مقام اگر کسی کو دے دے تو کیا کہنے ہیں۔ لیکن یہ کہ باطل کا غلبہ ہو' غیر اسلامی حکومت ہو' اور اس کی وہ تھانے داری فرما رہے ہوں تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ یہ ہے عدم توازن' کہ ذاتی زہد اور ذاتی تقویٰ کا غلو تو اس حد کو پہنچا ہوا ہے' لیکن باطل سے نبرد آزمائی اور حق کے غلبے کے لیے جدوجہد سرے سے خارج از بحث ہے۔ یہاں اس عدمِ توازن کو روکنا مقصود ہے جس کا ذکر ایک حدیث نبویؐ میں بایں الفاظ کیا گیا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَئِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا۔ قَالَ: فَقَالَ: یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ۔ قَالَ: فَقَالَ: اِقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ' فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ))(۱)

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستیوں کو اُن کے رہنے والوں سمیت الٹ دو''۔ آپؐ فرماتے ہیں: ''حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا: ''اے اللہ! اس بستی میں تو تیرا وہ بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔'' آپؐ نے فرمایا کہ ''اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''الٹ دو اِس کو پہلے اُس پر' پھر دوسروں پر' اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ کبھی تھوڑی دیر کے لیے بھی میری غیرت اور حمیت میں متغیر نہیں ہوا''۔

(۱) رواہ الامام البیہقی بحوالہ خطبات الاحکام' تالیف مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

ذرا اس شخص کی ذاتی نیکی کا اندازہ لگائیے کہ اپنے نفس کو مانجھ مانجھ کر اس انتہا کو پہنچ گیا کہ حضرت جبرئیلؑ اللہ تعالیٰ کے حضور گواہی دے رہے ہیں کہ اس نے کبھی ایک لمحہ بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کیا' لیکن اس کی بے غیرتی اور بےحمیتی بھی ملاحظہ کیجیے کہ اسے اس سے کوئی غرض ہی نہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے' کفر کس طرح دندنا رہا ہے' شیطنت کس طرح ننگا ناچ ناچ رہی ہے' بے حیائی کا سیلاب کس طور سے آ رہا ہے' اللہ کی شریعت کا استہزاء کس طرح ہو رہا ہے!

تو یہ جو عدم توازن ہے اس کو قرآنِ حکیم کے ان الفاظ کی روشنی میں دیکھئے: ﴿كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ﴾ یعنی بڑے بڑے گناہوں سے اپنے آپ کو بچا لیجیے' ان سے اپنا دامن پاک کر لیجیے اور بے حیائی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچا لیجیے۔ اس کے بعد میدانِ عمل میں قدم رکھئے' اس جدوجہد میں پڑیئے' تو مزید اصلاح ہو گی۔ لیکن اگر ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ اپنی اصلاح کے عمل کو کامل کر کے ہم اس جدوجہد میں قدم رکھیں گے تو وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔ آدمی کامل تو کبھی ہوگا ہی نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں کامل ہو گیا؟ جو یہ دعویٰ کرے وہ احمق ہے۔ اصلاح تو زندگی بھر کے لیے ایک مسلسل عمل ہے۔

حالتِ غصہ میں عفو و درگزر

اس سلسلے کا چوتھا وصف یہ بیان ہوا: ﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾﴾ ''اور جب انہیں غصہ آ جائے تو معاف کر دیتے ہیں''۔ اس آیت میں بیان کردہ یہ دوسرا وصف ہوا کہ انسان غصے میں آ کر کوئی قدم نہ اٹھائے' جھنجھلاہٹ میں آ کر زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالے۔ آپ آیت کے الفاظ پر غور کیجیے کہ یہاں غصے کی نفی نہیں ہے۔ سرے سے غصہ نہ آنا تو غیرت وحمیت کے فقدان کی علامت ہے۔ جس شخص کو غصہ آتا ہی نہیں وہ یا تو وہی شخص ہوگا جس میں غیرت وحمیت نہیں' یا پھر پرلے درجے کا کوئی منافق ہو گا۔ جو لوگ بہت زیادہ ٹھنڈے مزاج کے ہوتے ہیں وہ بڑے خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ نے انسان کے اندر غیرت وحمیت کا مادہ رکھا ہے جس کا اظہار غم وغصہ کی صورت میں ہوتا ہے' لہٰذا غصہ آنا چاہیے' البتہ ٹھیک جگہ پر آنا چاہیے' غلط جگہ پر نہیں آنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اگر شہوت کا جذبہ رکھا ہے تو وہ کوئی بری شے نہیں ہے' ہاں اس کو صحیح رُخ پر استعمال ہونا چاہیے' غلط راستہ پر نہیں پڑنا چاہیے۔ اسی طرح غصہ جو ہے اس کی نفی نہیں ہے' لیکن یہ کہ غصے میں کوئی اقدام کیا جائے گا تو غلط ہو جائے گا۔ انسان جو بھی اقدام کرے وہ غصہ رفع ہونے کے بعد کرے' اور اگر غصے کی حالت میں ہو تو معاف کرے۔

سورۂ آلِ عمران میں اہلِ تقویٰ کی صفات کے ضمن میں فرمایا: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط﴾ (آیت ۱۳۴) ''غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے''۔ یہ چیز خاص طور پر کسی اجتماعی جدوجہد میں بہت ضروری ہے۔ اگر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگے' غصے میں آدمی کچھ کہہ دے' غصے میں کوئی قدم اٹھا لے تو یہ بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ کو خلیل جبران کا فقرہ سنایا تھا کہ ''عقل سے رہنمائی حاصل کرو اور جذبے کے تحت حرکت کرو''۔ منزل کا تعین کہ جانا کہاں ہے' عقل سے ہو گا' ایسا فیصلہ جذبات میں کیا گیا تو غلط ہو جائے گا' البتہ جب طے کر لیا کہ ادھر جانا ہے تو اب عقل کو ایک طرف رکھ دو' چلنے میں یہ رکاوٹ بنے گی' قدم قدم پر مصلحتیں سجھائے گی' قدم قدم پر خطروں سے باخبر کرے گی تو چل نہیں پاؤ گے۔ جب آپ نے منزل کا تعین کر لیا تو عقل کا کام مکمل ہو گیا' اب اسے ایک طرف رکھو اور جذبے کے تحت حرکت کرو۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

اسی طرح غصے میں فیصلہ مت کرو' غصے میں اقدام مت کرو۔ غصہ آئے تو اسے پینے کی کوشش کرو اور ایسے میں مغفرت اور عفو کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرو۔

آگے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣٨﴾﴾

''اور جنہوں نے اپنے ربّ کی پکار پر لبیک کہی اور نماز قائم کی' اور وہ اپنے معاملات باہم مشورے سے چلاتے ہیں' اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اللہ کی پکار پر لبیک کہنا

یہاں استجابت کا لفظ آیا ہے جو ہم گزشتہ درس میں پڑھ چکے ہیں: ﴿اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ﴾ اور یہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ وہ پکار کون سی ہے۔ اس سے مراد ہے: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ط﴾ ''دین کو قائم کرو اور دین کے باب میں (اور اقامت دین کی جدوجہد میں) متفرق نہ ہو جاؤ''۔ یہاں دو آیتوں میں چار اوصاف اس سے پہلے بیان کر کے پانچواں وصف یہ فرمایا کہ ''وہ اپنے ربّ کی پکار پر لبیک کہتے ہیں''۔ ان اوصاف کے درمیان صحیح ربط یہ قائم ہوا کہ یہ چار بنیادی شرائط ہیں، جو شخص یہ چار کام کر لے وہ اس وادی میں قدم رکھے۔ اگر مال و دولتِ دنیا کی وقعت اور محبت ابھی دل میں ہے اور آپ اقامتِ دین کے اس راستے میں پڑ گئے تو خود آپ کی اپنی شخصیت اور کام دونوں کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے کہ یہی شے درحقیقت منافقت کے لیے تمہید بنتی ہے۔ اگر اللہ پر توکل نہیں ہے تو بھی وہ کام کسی غلط رُخ پر پڑ جائے گا۔

اسی طرح اگر اپنے آپ کو ابھی بڑی بڑی خرابیوں سے بھی نجات نہیں دلائی ہے اور ضبطِ نفس ابھی اتنا نہیں ہوا کہ غصے کو قابو میں رکھ سکو تو بھی آپ غلط شروعات کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ وہ حدیث آپ کو معلوم ہے جس میں حضور ﷺ نے منافق کے چار اوصاف بیان کیے کہ جس میں یہ چاروں موجود ہیں وہ پکا اور کٹر منافق ہے، اور جس میں ان میں سے ایک وصف موجود ہے اس میں اسی نسبت سے نفاق موجود ہے۔ اس حدیث میں چوتھا وصف یہ بیان ہوا: ((وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ))[1] کہ جب وہ کسی سے جھگڑتا ہے تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے، پھٹ پڑتا ہے، گالم گلوچ پر اتر آتا ہے۔ اسے اپنے اوپر کنٹرول ہی نہیں رہتا، غصے میں اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو مُنہ میں آیا بک دیا اور جو اینٹ روڑا ہاتھ میں آیا، دے مارا۔ تو یہ درحقیقت نفاق کی ایک علامت ہے۔ چنانچہ غصے کی حالت میں ضبطِ نفس کی تلقین فرمائی گئی۔ یہ چار اوصاف بیان فرما دیے گئے کہ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے میدان میں آنے سے پہلے آدمی یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کر لے۔ یہ گویا pre-requisites کے درجے میں ہیں۔ اسی لیے یہاں پر اب پانچواں وصف یہ بیان فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّھِمْ﴾ ''وہ لوگ کہ جو اپنے ربّ کی پکار پر لبیک کہیں''۔ جو اپنے ربّ کی دعوت قبول کریں۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب علامة المنافق۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال المنافق۔

ہم استقامت اور اقامت کے فرق پر بحث کر چکے ہیں۔ اقامت کا ایک شاذ مفہوم وہ ہے کہ جو استقامت کا اصل مفہوم ہے لہٰذا کہیں کہیں استقامت کی جگہ لفظ اقامت بھی استعمال ہو جاتا ہے، لیکن اقامت کا اپنی جگہ پر اصل مفہوم کسی شے کو قائم کرنا ہے۔ اسی طرح کے یہ دو الفاظ اجابت اور استجابت ہیں۔ اجابت بھی کسی کی دعا یا کسی کی پکار کو قبول کرنے اور کسی کی ندا پر لبیک کہنے کے معنوں میں استعمال ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لیے اصل لفظ استجابت ہے۔ لفظ ''اجابت'' کے مختلف صیغے قرآن مجید میں آٹھ جگہ استعمال ہوئے ہیں، جبکہ لفظ ''استجابت'' کے صیغے قرآن حکیم میں اٹھائیس مقامات پر آئے ہیں۔ اور اس سورۂ مبارکہ میں تو تین مرتبہ استجابت کا لفظ آیا ہے۔ سب سے پہلے آیت ۱۶ میں فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ یُحَاجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ حُجَّتُھُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَعَلَیْھِمْ غَضَبٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۶﴾﴾

اس کے بعد آیت زیر مطالعہ میں لفظ ''اِسْتَجَابُوْا'' آیا --- اور پھر سورۃ کے آخری حصے میں آیت ۴۷ میں ''اسْتَجِیْبُوْا'' کا لفظ آیا۔ بہرحال، اب یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّھِمْ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو لبیک کہیں اپنے ربّ کی پکار پر''۔

اقامتِ صلوٰۃ

﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ص﴾ ''اور نماز قائم کریں''۔ وہ اپنی اس جدوجہد کے لیے جو اجتماعی ہیئت قائم کریں اس کا اہم ترین وصف اقامتِ صلوٰۃ ہوگا۔ اقامتِ صلوٰۃ کو اس اجتماعیت میں مرکزہ (nucleus) کی حیثیت حاصل ہوگی، جس طرح کہ چکی کے درمیان وہ کلی ہوتی ہے جس پر وہ گھومتی ہے۔

سورۃ الفتح کی آخری آیت میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿تَرٰىھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا ز﴾ ''تم انہیں دیکھو گے تو رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے''۔ اپنے انفرادی معاملے کے اعتبار سے وہ نماز نفل ہے، تہجد ہے، قیام اللیل ہے، یعنی انفرادی اعمال میں تو تقرب بالنوافل کی اہمیت زیادہ ہے۔ لیکن اجتماعیت کے اعتبار سے اصل اہمیت تقرب بالفرائض کی ہے، چنانچہ یہاں اصل شے فرض نماز ہے۔ لہٰذا یہاں فرمایا: ﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ﴾ ''وہ نماز کو قائم رکھتے ہیں''۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پورا پروگرام، ان کے معمولات، ان کے چوبیس گھنٹے کے مشاغل اس نظامِ صلوٰۃ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں، ان کی پوری زندگی میں نماز کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔

شورائیت کا نظام

﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَيْنَهُمْ ص ﴾ ’’اوران کا معاملہ باہم مشورے کے ساتھ چلتا ہے‘‘۔اب چونکہ اجتماعی معاملات کا ذکر آ گیا تو مشورے کی اہمیت بھی واضح کر دی گئی۔ لیکن یہاں یہ بات سمجھ لیجیے کہ شورائیت اور جمہوریت دو مختلف چیزیں ہیں۔ایک تو ان میں بنیادی طور پر فرق ہے کہ جمہوریت اصل میں حاکمیت کے تصور کے ساتھ ہوتی ہے' جبکہ شورائیت میں وہ حاکمیت کا تصور بالکل نہیں۔عوامی جمہوریت کا موجودہ تصور عوامی حاکمیت کا ہے' یعنی حاکمیت میں تمام عوام شریک ہیں' جبکہ شورائیت جو ہے وہ باہم مشاورت ہے۔اس شورائیت کے بھی دو مختلف shades ہیں جن کا تعلق مختلف حالات سے ہے۔ایک حکومت کی سطح پر شورائیت ہے اور ایک کسی جماعت یا تحریک کی سطح پر شورائیت ہے' اوران میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس کی ایک علاقائی عملداری (territorial jurisdiction) ہوتی ہے' یعنی ایک علاقہ ہے جس پر حکومت قائم ہے اور اس میں جو کوئی بھی ہے وہ اس حکومت میں شامل ہے' شریک ہے اوران کی حیثیت مساوی ہے' جبکہ جماعت میں کوئی علاقائی تسلط نہیں ہوتا' اس میں جو داخل ہوتا ہے اپنی مرضی سے اور جو اس سے نکلتا ہے اپنی مرضی سے۔دوسرے یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے جو جماعت قائم ہوتی ہے وہ اس طرح ہوتی ہے کہ ایک داعی ’’مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ‘‘ کی پکار لگاتا ہے اور کچھ لوگ اس پکار پر لبیک کہہ کر جمع ہو جاتے ہیں۔لہٰذا یہاں ایک فرقِ مراتب بھی ہے' جو ریاست میں نہیں ہوتا' وہاں سب شہری برابر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان دو فرقوں کی وجہ سے جماعت اور تحریک کی سطح پر شورائیت اور حکومت کی سطح پر شورائیت کے تقاضے مختلف ہیں۔

اگر چہ خلافت راشدہ کے بارے میں جو بھی میرا مطالعہ ہے اس کی بنیاد پر میں پورے انشراحِ صدر سے کہہ رہا ہوں کہ خلفائے راشدین کے ہاتھ میں ویٹو تھا' خلافتِ راشدہ میں آپ کو کہیں ووٹوں کی گنتی کا ذکر نہیں ملے گا' لیکن اب اگر کوئی اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے تو اس کا جو بھی دستور بنے گا اس میں سربراہِ ریاست کے ہاتھ میں ویٹو کا ہونا ضروری نہیں ہے' بلکہ انتخاب کے ذریعے سے جو بھی ایک ادارہ وہاں وجود میں آ جائے اس میں ووٹوں کی گنتی سے فیصلے ہوں' اور کسی کے ہاتھ میں اختیارِ خصوصی نہ دیا جائے تو ’’اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَيْنَهُمْ‘‘ کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔لیکن جماعت اس نہج سے نہیں چل سکتی۔وہاں حکومت کے پاس ڈنڈا بھی ہوتا ہے' یہاں جماعت کے اندر کوئی ڈنڈا نہیں ہوتا۔ وہاں ان کے پاس نظم کو قائم رکھنے کے لیے کئی طرح کے معاون ادارے ہوتے ہیں' یہاں کوئی اور چیز نہیں ہے سوائے اس کے کہ ایک اتفاق رائے ہے' لوگوں کی آزادانہ مرضی ہے' ساتھ دینا چاہیں تو دیں' نہ دینا چاہیں نہ دیں' کوئی جبر نہیں۔لہٰذا جماعت کے معاملے کو حکومت و ریاست پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔یہ ایکسرسائز وہ لوگ کرتے ہیں جنہوں نے اس وادی میں قدم رکھنا ہی نہیں' آگے بڑھنا ہی نہیں' کام کرنا ہی نہیں۔وہ تھیوری اور نظریے کے اعتبار سے جو چاہیں بحث کر لیں۔

جماعتی سطح پر شورائیت کا تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں مشورے کی روح جاری وساری رہے' یہ احساس نہ ہو کہ یہاں پر کوئی تحکمانہ انداز (authoritarianism) ہے' بلکہ مشورہ ضرور کیا جائے' لیکن پھر مشورے کے بعد فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہ ہو بلکہ جو صاحبِ امر ہے' جس پر اعتماد کر کے آپ نے اس کی رفاقت قبول کی ہے' اب فیصلہ آپ اُس پر چھوڑ دیں۔یہ بات میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ سے اخذ کرتا ہوں' جہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ج فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط﴾ یعنی آپؐ ان سے معاملے میں مشورہ ضرور کیا کیجیے' پھر جو فیصلہ آپؐ کر لیں اس پر ڈٹ جائیے اور اللہ پر توکل کیجیے۔دیکھ لیجیے یہاں ’’عَـزَمْـتَ‘‘ ہے' ’’عَـزَمْتُـمْ‘‘ نہیں ہے۔یہ نہیں ہے کہ فیصلہ counting of votes سے ہوگا' تعداد کی بنیاد پر ہوگا' بلکہ مشورہ امیر کی ضرورت ہے' لہٰذا وہ اپنے ساتھیوں کو مشورہ میں شریک کرے گا' لیکن حتمی فیصلے کا اختیار امیر کو ہوگا۔پس ایک اسلامی جماعت اور تحریک کا نظم یہی ہو سکتا ہے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

انفاق فی سبیل اللہ

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ’’اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں‘‘۔کھپاتے ہیں' لگاتے ہیں' صرف کرتے ہیں۔اس میں وہ سب کچھ لے آیئے جس کے بارے میں فرمایا گیا: ’’فَمَآ اُوْتِيْتُمْ‘‘ اور جو سورۃ الحدید میں فرمایا: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ ’’اور اس میں سے خرچ کرو جس چیز میں بھی اس نے تمہیں خلافت عطا فرمائی‘‘۔تمہاری ذہانت بھی اللہ کا ایک عطیہ ہے جو اُس نے تمہیں دیا' تمہاری قوتِ کار اور تمہاری توانائیاں بھی اللہ کی عطا کردہ ہیں۔جو مال واسباب تمہارے پاس ہے یہ اسی کا دیا ہوا ہے' اس کا عطیہ ہے' اولاد ہے تو اسی کی دی ہوئی ہے' اس کا عطیہ ہے۔ان سب کو لگاؤ اور کھپاؤ اللہ کی راہ میں۔اس کے بغیر تو ظاہر بات ہے قدم آگے کیسے بڑھے گا! یہ ساری چیزیں تو محفوظ رہیں' انہیں انسان بچا بچا کے رکھے اور خواہش کرتا رہے کہ کوئی دین کا کام بھی ہو جائے' تو کیسے ہو جائے گا! ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

بدلہ اور قصاص یا عفو و درگزر؟

مطلوبہ اوصاف کے ضمن میں متذکرہ بالا تین آیات بہت اہم اور بہت بنیادی ہیں' اور ان میں سے ایک ایک میں کئی کئی چیزیں آ گئی ہیں۔ اب اس کے بعد جو آیات آ رہی ہیں' ان میں ایک مضمون بدلہ اور قصاص کا آ رہا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾﴾

''اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو بدلہ لیتے ہیں۔''

یہ اس درس کی چوتھی آیت ہے' اور اس مضمون پر ایک بحث اگلی چار آیات پر محیط ہے۔ یہاں بظاہر ایک بڑا ہی مختلف انداز ہے اس سے جو عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ دین کی دعوت کے ضمن میں ہونا چاہیے اور جس کی تلقین واقعتاً قرآن مجید میں بھی دعوتِ دین کے ضمن میں کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ دعوت کے میدان میں اور دعوت کی سطح پر' دعوت کے مرحلے پر یہی مطلوب ہوگا کہ لوگ گالیاں دیں تو تم دعائیں دو' لوگ پتھر ماریں تو تم پھول پیش کرو۔ وہاں بدلہ لینا دعوت کے راستے کی رکاوٹ بن جائے گا۔ یہ قرآن مجید کا حسنِ ربط' حسنِ ترتیب اور حسنِ اعجاز ہے کہ اس میں ہر سطح اور ہر مرحلے کے لیے ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ پچھلی سورت حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون چونکہ دعوت ہے لہٰذا وہاں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿٣٤﴾﴾ ''اور نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کا جواب اس نیکی سے دو جو بہترین ہو' پھر تم دیکھو گے کہ جس شخص کی تمہارے ساتھ عداوت تھی وہ جگری دوست بن گیا۔'' گویا دشمن کے بُرے رویے کے جواب میں حسن سلوک سے کام لینا' ان کی گالیوں کے جواب میں ان کو دعائیں دینا' ان کے تشدد اور ایذا رسانی کے جواب میں ان کی خدمتیں کرنا' یہ دعوت کی تاثیر کے لیے لازم ہے۔ لیکن کیا اہل ایمان کا یہی دائمی وصف ہوگا؟

اوّل تو یہ جان لیجیے کہ اقامت دین سے جو شے مطلوب ہے وہ اقامتِ عدل وقسط ہے۔ میں اپنے مختلف خطابات میں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ اکثر و بیشتر قانون کا تقاضا اخلاق و روحانیت کے تقاضے سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ کو کوئی تھپڑ دے مارے تو اب آپ کے لیے دو راستے ہوں گے۔ ایک یہ کہ جواباً آپ بھی تھپڑ رسید کریں' ایک یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اگر انتقام لینے کی قدرت رکھنے کے باوجود آپ معاف کرتے ہیں تو یہ آپ کی انفرادی تربیت اور روحانی ترفع کی طرف پیش قدمی کے لیے تو مفید ہے' لیکن اس سے اجتماعی سطح پر یہ نقصان ظاہر ہوگا کہ شریروں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ جس نے ایک تھپڑ آج آپ کو مارا ہے' کل کسی اور کو مارے گا' اس لیے کہ اسے جوابی تھپڑ رسید نہیں ہوا' چنانچہ اس کی شرارت کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ لہٰذا اجتماعی سطح پر اس کا تقاضا یہ ہے کہ ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ: ۱۷۹) ''اور اے ہوش مندو! بدلہ لینے میں تمہارے لیے زندگی ہے!'' جس نے کسی کو تھپڑ رسید کیا ہے اس کو جوابی تھپڑ رسید کرو' ورنہ اس کی حوصلہ افزائی ہوگی' شرارت بڑھے گی اور زندگی کا نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ یہی اسلامی تعزیرات کا فلسفہ ہے۔ شدید ترین تعزیرات اور شدید ترین سزاؤں کا مقصد یہی ہے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ نے ایسے حضرات کو بھی رجم کروایا کہ جن کے بارے میں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے مدینے کی پوری آبادی پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کی مغفرت کے لیے کافی ہو جائے۔ اس کے باوجود انہیں رجم کروایا' اس لیے کہ اس کے ذریعے سے زنا کا سدّ باب ہوگا۔ اگر سزا نافذ نہیں کرتے' معاف کر دیتے ہیں تو زنا کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھے گا۔ یہ دو چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اسی طرح جو کچھ آپ نے حلال ذریعے سے کمایا' قانونی سطح پر اس میں سے صرف زکوٰۃ اور عشر لینے کے بعد جو کچھ آپ کا ہے وہ آپ کو دیا جائے گا' آپ کا حق تسلیم کیا جائے گا' لیکن اخلاقی سطح پر تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ بھی زائد از ضرورت ہے' اللہ کی راہ میں دے دو! تو یہ دو چیزوں میں بظاہر فرق ہے۔ بعض لوگ اس کو exploit کرتے ہیں کہ یہ تضادات ہیں۔ یا پھر ایک پہلو کو وہ کسی وجہ سے چھپاتے ہیں اور دوسرے کو نمایاں کرتے ہیں تو یہی درحقیقت گمراہی کی جڑ بن جاتی ہے۔ دونوں چیزوں کو بیک وقت نگاہ میں رکھیے۔ دعوت کے مرحلے پر عفو و درگزر اور اقامت کے مرحلے پر بدلہ اور انتقام۔

چنانچہ آگے فرمایا: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ﴾ ''اور برائی کا بدلہ تو برائی ہے ویسی ہی''۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اب وہ بھکشوؤں کا سا انداز نہیں رہا' اب وہ خانقاہیت والا نظام یہاں نہیں رہا۔ یہ تو بڑا جارحانہ اور militant انداز ہے۔ ان دونوں کا مقام اپنی اپنی جگہ پر ہے۔ ہر شے کو اس کے مقام پر رکھئے' اس کا نام عدل اور انصاف ہے۔ کسی چیز کو اپنے مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیں گے تو یہ ظلم ہے۔ ظلم کی تعریف ہے: ''وضع الشّیء فی غیر محلّہ'' یعنی کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دینا۔ ہر شے کو اس کے مقام پر رکھئے۔ یہاں ''مِثْلُهَا'' کے لفظ سے یہ بھی اشارہ ہوگیا کہ جتنی زیادتی ہوئی ہے اتنی ہی زیادتی ہو' اس سے زائد نہیں۔ یہ نہ ہو کہ انتقام کے جوش میں آ کر ایک تھپڑ کے بدلے میں دس تھپڑ مارے جائیں۔ یہ جائز نہیں' بلکہ ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ﴾ ''اور برائی کا بدلہ تو ویسی ہی برائی ہے''۔

البتہ اس کے ساتھ ہی فرما دیا: ﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ط﴾ ''تو جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے''۔ یہاں ایک بڑا لطیف اشارہ کر دیا گیا کہ معافی اس صورت میں دی جائے اگر یہ نظر آ رہا ہو کہ اس سے اصلاح ہو جائے گی۔ ایسی معافی نہ ہو جو شریروں کی ہمت افزائی کا ذریعہ بن جائے۔ جہاں آپ یہ محسوس کریں کہ زیادتی کرنے والے پر واقعی ندامت طاری ہو چکی ہے اور اسے اپنے کیے پر بڑا پچھتاوا ہے' میں اگر اسے معاف کر دوں گا تو اس میں اصلاح کی کیفیت پیدا ہو گی' اور آپ اسے معاف کر دیں تو اس طرح آپ اپنے لیے بہت بڑا اجر کما سکتے ہیں۔

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا''۔ اگر عفو سے ظلم کی جڑ کٹ جاتی ہو' اصلاح ہو جاتی ہو تو عفو بہتر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں کہ ظالموں کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی ہو اور نیک لوگ کونوں کھدروں میں' خانقاہوں میں بیٹھے رہیں اور شریروں کے لیے دنیا چھوڑ دیں۔ انہیں شریروں کی سرکوبی کے لیے میدان میں آنا ہو گا۔

﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝﴾ ''اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان پر کوئی ملامت نہیں''۔ میں نے عرض کیا تھا کہ دونوں چیزیں بیک وقت اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میرے معاف کر دینے سے اصلاح ہو جائے گی' بہتری کی توقع ہے تو معاف کر دے۔ اس کا اجر اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے معاف کرنے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے میں تو بدلہ لوں گا تو آپ اس کو ملامت کرنے کے درپے نہ ہو جائیں کہ دیکھو اچھا کام چھوڑ کر برا کام کر رہا ہے۔ یہاں واضح کر دیا گیا کہ جو کوئی بدلہ لے' انتقام لے اس کے بعد کہ اُس پر ظلم ہوا ہے تو ایسے لوگوں کے اوپر کوئی ملامت کا راستہ نہیں ہے' آپ انہیں discourage نہیں کر سکتے' آپ انہیں ملامت نہیں کر سکتے۔ وہ ان کا حق ہے' وہ بدلہ لے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں سورۃ النساء میں تو یہاں تک فرما دیا: ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ط﴾ (آیت ۱۴۸) ''اللہ تعالیٰ کو کسی بری بات کا بلند آواز سے کہنا پسند نہیں ہے' سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہو''۔ مظلوم اگر اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے درد سے کراہتے ہوئے چیخ و پکار کرتا ہے اور اس کی زبان سے اگر کوئی برا کلمہ نکل جاتا ہے تو اسے معاف کیا جائے گا' اس سے درگزر کیا جائے گا۔ عام حالات میں بری بات کا زبان سے نکالنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو وہ مستثنیٰ ہے۔

﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط﴾ ''یقیناً ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں''۔ لہٰذا اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے جو جماعت وجود میں آئے وہ منظم ہو کر ان لوگوں کے مقابل خم ٹھونک کر میدان میں آئے جو ظلم کر رہے ہیں' جو لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرتے ہیں' جنہوں نے لوگوں کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ یہ ظلم معاشرتی بھی ہوتا ہے' معاشی بھی ہوتا ہے اور سیاسی بھی ہوتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کو اپنا محکوم بنا لیں' وہ ظالم ہیں۔ جو معاشی طور پر دوسروں کو مفلوج کریں' وہ ظالم ہیں۔ جو دوسروں کے حقوق پر دست درازی کریں' وہ ظالم ہیں۔ جنہوں نے کچھ لوگوں کو گھٹیا قرار دے دیا ہے' وہ سب سے بڑھ کر ظالم ہیں۔ اسی گوشت پوست کے بنے ہوئے اور ایک آدم وحوا کی نسل سے پیدا ہونے والے انسانوں میں سے بعض کو بڑھیا اور اعلیٰ قرار دے دینا اور بعض کو گھٹیا اور ادنیٰ سمجھنا بہت بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ ظلم خواہ معاشرتی سطح پر ہو یا معاشی سطح پر یا سیاسی سطح پر' جو بھی ظلم کا ارتکاب کر رہا ہے وہ ظالم ہے' اور سب سے بڑا ظلم اللہ کی زمین پر غیر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ یہ زمین اللہ کی ہے' وہ اس کا جائز حاکم ہے' جو اس حاکمِ حقیقی کے خلاف بغاوت کر رہا ہے اور ناحق سرکشی کر رہا ہے اس سے بڑا ظالم اور کون ہو گا؟ چاہے اس نے کچھ خیراتی ادارے بھی قائم کر دیے ہوں' فاؤنڈیشنز بنا دی ہوں' چاہے وہ ویلفیئر سٹیٹ بنائے بیٹھا ہو' لیکن اللہ کا حق غصب کیے ہوئے ہے اور اللہ کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلوا رہا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جن کے لیے دردناک عذاب ہے''۔ ان ظالموں کے لیے آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے اور دنیا میں بھی تم اپنے غصے اور ملامت کا ہدف اِن لوگوں کو بناؤ' نہ کہ اُن لوگوں کو جو مظلوم ہیں۔

ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں سے
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم چرخ سے آ کر!

یہ شعر دراصل فارسی کے اس شعر کا اردو ترجمہ ہے

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید!

ماہر القادری مرحوم کہتے ہیں کہ کوئی دعا ایسی بھی ہوتی ہے جس کی قبولیت کے لیے رحمتِ خداوندی پہلے سے بے تاب ہوتی ہے۔ دعا کریں تو سہی! ع ''ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!'' ایک دعا وہ بھی ہے جس کے لیے حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کے پچھلے پہر سمائے دنیا پر نزول فرما کر ارشاد فرماتا ہے: ((هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَأُعْطِيَهُ؟ هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ؟))(۱) ''ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں؟ ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اسے بخش دوں؟''

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاة المسافرین وقصرھا' باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل والاجابۃ۔ ومسند احمد۔ (الفاظ مسند احمد کے ہیں)

تو ماہر صاحب نے بھی اسی انداز میں ایک شعر کہا ہے ؎

یہ کون پچھلے پہر رات کو ہے محوِ سجود
دعا کو ڈھونڈ رہی ہیں ابھی سے تاثیریں!

بہر حال یہ ذہن میں رکھئے کہ یہ ظلم' یہ عدوان' یہ تعدی' یہ استحصال جس شکل میں بھی ہے ان لوگوں کے لیے ایک چیلنج ہے کہ جو اللہ کے بندے ہیں' جو اللہ کی زمین پر اللہ کی حاکمیت کے علمبردار ہیں' جو اس کے نظامِ عدل وقسط کے نام لیوا ہیں۔ ان کے خلوص واخلاص اور ان کی محبت خداوندی کا ثبوت یہ ہے کہ ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون (ہیں اس کے وفادار بندے جو قوت کو ہاتھ میں لے کر' لوہے کو ہاتھ میں لے کر) اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں' غیب میں رہتے ہوئے''۔ اس کی مدد کیا ہے؟ اس کے دیے ہوئے نظامِ عدل وقسط کا قیام' اس کے دین کا غلبہ! رسولوں کی مدد کیا ہے؟ کہ یہ اصلاً فرضِ منصبی رسول کا ہے' جو کوئی اس میں ہاتھ بٹاتا ہے وہ ان کا اعوان وانصار بنتا ہے۔

آخری آیت ہے: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿٤٣﴾﴾ ''اور جو کوئی صبر کرے اور معاف کر دیا کرے' تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے''۔ اس راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر عفو ودرگزر کی ضرورت پیش آئے گی اور سب سے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کے ضمن میں پیش آئے گی۔ ساتھی بھی تو ایک دوسرے پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں۔ حضور ﷺ کے ساتھ اپنوں نے کیا نہیں کیا ؎

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت!

یہ تو آج ہم کہتے ہیں کہ فلاں منافق تھا' فلاں منافق تھا' اس وقت تو وہ بظاہر حضور ﷺ کے ساتھی تھے' لیکن کیا کر رہے تھے؟ کیا کچھ کیا ہے عبداللہ بن ابی نے! نہ معلوم کس کس نے کس کس طور سے ایذا پہنچائی ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شکوہ نقل ہوا ہے: ﴿يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ط﴾ (الصّف: ۵) ''اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں مجھے ایذا پہنچا رہے ہو درآں حالیکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں''۔ آپ اندازہ کیجیے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے جب یہ الفاظ نکلے ہوں گے تو کتنا دکھا ہوا دل ہو گا۔ یہ فرعون اور آلِ فرعون کے مظالم کا شکوہ نہیں ہے' بلکہ اپنوں کے ہاتھوں جو چرکے اٹھائے ہیں ان کا ذکر ہے۔ تو بہر حال اس کا ایک محل تو یہ ہو گا کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ ہو ع ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم! لیکن ظالموں' کافروں اور زمین میں جو اللہ کے باغی ہیں ﴿الَّذِيْنَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ اور اپنی حکمرانی کے دعوے دار ہیں ان سے انتقام اور بدلہ لیا جائے۔

آخر میں صرف ایک بات مزید نوٹ کر لیجیے کہ انقلابی تحریک کا ایک دَور وہ ہوتا ہے جس میں حکم یہ ہوتا ہے کہ اس وقت اپنے ہاتھ روکے رکھو ﴿كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ﴾۔ یہ حکم مستقل نہیں ہوتا' بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اپنے غیظ وغضب کو اپنے اندر پالتے رہو' اپنے آپ کو منظم کرو اور ایک طاقت بن جاؤ! علامہ اقبال کا یہ شعر اسی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے ؎

نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

ایک وقت آئے گا جب تمہارے ہاتھ کھول دیے جائیں گے' پھر یہ لاوا پورے زور شور کے ساتھ نکلے گا۔ اور وہ اُس وقت نکلا جب قرآن میں یہ حکم نازل ہوا: ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿٣٩﴾﴾ (الحج) ''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو (جنگ کی) جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے''۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم' ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم ○○